مولانا گیلانیؒ کی ترجمہ نگاری-ایک جائزہ

ڈاکٹر امان اللہ راٹھور *

مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ (۱۸۹۲ء-۱۹۵۶ء) بیسویں صدی کے جید عالم دین، فلسفی، مورخ، ماہر تعلیم اور سوانح نگار و سیرت نگار ہی نہ تھے، بلکہ انہوں نے بعض کتابوں کے تراجم بھی کیے، یوں ان کی کاوشوں سے اردو زبان و ادب کو بہترین تراجم کے نمونے حاصل ہوئے۔ اس سے اردو ادب کے ذخیرہ تراجم میں اضافہ بھی ہوا اور مولانا کے اسلوب نگارش کے لیے نئی راہیں بھی کھلیں۔ اردو ادب میں اس وقت تک تراجم کی روایت موجود تھی، ایک صدی قبل سے اردو تراجم کا باقاعدہ سلسلہ قائم تھا۔ لیکن اردو تراجم کی وہ روایت جو دہلی کالج اور فورٹ ولیم کالج سے شروع ہوئی تھی، ۱۸۵۷ء کے بعد اس میں بہت سی تبدیلیاں آچکی تھیں۔ انگریزی زبان و ادب کی کتابیں زیادہ تر ۱۸۵۷ء کے بعد اردو میں منتقل ہونا شروع ہوئی تھیں۔ اس سے قبل عربی اور فارسی کے اردو تراجم موجود تھے۔ سید مناظر احسن گیلانی نے اپنی زندگی کے ابتدائی برسوں میں جب ہمت جوان اور ہمتِ کار کے لحاظ سے مستعد تھے، بعض طویل سفر کیے۔ یہ اسفار حصول علم کے لیے تھے اور تعلیم و تعلم کا سلسلہ برقرار رکھنا بھی مقصود تھا۔ ان اسفار میں انھیں بعض مقامات پر اپنی لیاقت کے اظہار کا موقع ملا۔ انھیں دقیق فلسفیانہ کتب کے مطالعے کا شوق بھی تھا۔ اور اپنے مدرسے سے حصول تعلیم کے دوران فلسفہ و منطق ہی کی کتب پر خاص توجہ بھی دی تھی۔ انھیں ریاست ٹونک میں ایک ایسے مدرسے میں حصول علم کا موقع ملا جہاں منطق و فلسفہ کی حکمرانی تھی۔ اس دینی مدرسے کا تشخص ہی فلسفہ و منطق سے تھا۔ چنانچہ انھوں نے فلسفے کی نصابی کتب کے علاوہ بھی منطق و فلسفہ کی مشہور کتب کے مطالعے میں وقت صرف کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی تحریر و تقریر میں استدلال و براہین قائم کرنے اور واقعات و حالات سے نتائج اخذ کرنے کا منطقی اسلوب بیان پیدا ہوا۔ ان کی ابتدائی دور کی کتابیں اس بات کی شاہد ہیں کہ اسی منطقی رجحان نے انھیں واقعات کے نادر نتائج تک پہنچا دیا۔ مولانا گیلانیؒ کے ابتدائی دور میں اردو زبان میں تراجم کا اتنا زیادہ کام نہیں ہوا تھا۔

اردو میں تراجم سے قبل ہندوستان کی قدیم ادبی فضا پر عربی اور فارسی زبانیں غالب نظر آتی ہیں۔ ان زبانوں کے فروغ کے اسباب میں سیاسی صورت حال کو بہت زیادہ دخل ہے۔ عموماً یہ ہوتا ہے کہ سیاسی فتح کے ساتھ تہذیب و تمدن پر بھی غلبہ حاصل ہو جاتا ہے۔ مسلمانوں کی آمد نے پاک و ہند کی اُس وقت کی تہذیب پر اثر انداز ہو کر اس کا چولا بدل ڈالا۔ محمد بن قاسم کی آمد سے لے کر محمود غزنوی کے حملوں تک تقریباً تین سو سال کا دورانیہ تہذیبوں، زبانوں اور ثقافتوں کے اختلاط اور ملاپ کا ایسا زمانہ ہے جس میں واضح طور پر ایک نئی تہذیب و ثقافت اور ایک نئی زبان سامنے آگئی (۱) ہے۔ اسی زبان میں انھی دو غیر ملکی زبانوں (عربی

* لیکچرر، گورنمنٹ ڈگری کالج ڈسکہ، سیالکوٹ

اور فارسی) سے تراجم ہونا شروع ہوئے۔

مولانا گیلانیؒ نے جس دور میں اردو تراجم کا کام کیا تو اس وقت تک اردو زبان ترجمے کے بہت سے مراحل طے کر چکی تھی۔ وہ خود جامعہ عثمانیہ میں شعبہ دینیات میں استاد تھے۔ یہیں انھیں جدید علوم سے واسطہ پڑا۔ جامعہ عثمانیہ میں مولانا گیلانیؒ کی ملازمت کا آغاز ۱۹۲۰ء میں ہوا (۲)۔ قبل ازیں وہ دارالعلوم دیوبند کے دینی رسالے الرشید اور القاسم سے منسلک رہے تھے (۳)۔ دیوبند کے اس مختصر قیام میں انھیں تصنیف و تالیف اور ترجمہ و ترتیب کا تجربہ ہو چکا تھا۔ دینی مدارس کے فارغ التحصیل طبع زاد فکری کاوشوں اور تراجم میں عربی فارسی کے ثقیل الفاظ استعمال کرتے تھے، ان کے ماحول اور دینی کتب میں یہ روایت گوارا کر لی جاتی تھی۔ اگرچہ علما کی طرف سے ترجمے ہوتے رہتے تھے اور ان کی پذیرائی بھی ہوتی رہی تھی لیکن مولانا گیلانیؒ کے دور تک پہنچ کر اردو تراجم کے لیے اصول و قواعد اور وضع اصطلاحات کی بحثیں نتیجہ خیز ہو چکی تھیں۔ مترجم کے اوصاف اور اس کی صلاحیت کا سوال پیدا ہوا۔ پھر اسلوب بیان پر قدرت کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ مغربی علوم کی نئی کتابیں متعارف ہوئیں تو ان کے تراجم میں نئی اصطلاحات کا فیصلہ پیدا ہوا۔ یہ دور مشرق کے علوم اور ان کی افادیت کے نقطہ نظر سے کئی سوالات پیدا کر رہا تھا۔ اسی سے زبان پر بھی اثرات پڑ رہے تھے۔ مغربی علوم اپنا تسلط قائم کر چکے تھے مغربی نظام تعلیم اور نظام سیاست نے مشرقی علم و ادب کے سانچے کو بدل دیا تھا۔ تصنیف و تالیف اور علمی فضا میں تبدیلی آ چکی تھی مجموعی طور پر اس وقت ہندوستان کی علمی دنیا میں ایک نیا شعور پیدا ہو گیا تھا اور اس نئے شعور کے بیدار ہونے قومی و علمی مزاج کے پیدا ہونے میں فورٹ ولیم کالج اور دہلی کالج کی علمی سرگرمیوں کو بہت زیادہ دخل حاصل ہے (۴)۔

۱۸۵۷ء سے قبل اردو ادب میں مذہبی کتابیں، تاریخی واقعات اور تصوف کے بارے میں کتابیں تھیں۔ عربی اور فارسی میں جو کتابیں لکھی جاتی تھیں۔ اردو زبان میں ان کا ترجمہ کم مرتبہ سمجھا جاتا تھا۔ شاہ ولی اللہ کے عہد میں پورے قرآن مجید کا فارسی میں ترجمہ ہوا تو اسے بھی اچھی نظر سے نہ دیکھا گیا پھر قرآن مجید کا اردو ترجمہ ہوا تو بہت محتاط انداز میں ترجمہ کیا گیا تا کہ لوگ اسے کوئی غیر اسلامی کام نہ سمجھیں۔ عربی اور فارسی سے اردو ترجمہ کرنے میں ایک رکاوٹ یہ بھی تھی کہ اردو زبان اتنی باثروت نہ تھی کہ عربی فارسی کے علمی نکات کو اپنے اسلوب کے مطابق بیان کر سکتی۔ ذخیرہ الفاظ کی کمی اور اردو کی ابتدائی صورت ہونے کے باعث موزوں تراکیب کے فقدان کے باعث تراجم میں رکاوٹیں پیدا ہوتی تھیں۔

عبدالباری ندوی نے ترجمے کی نزاکت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ کلاسیکی کتابوں کے ترجمے کا اصول کیا ہو؟ ترجمہ نگاری کی دو صورتیں ہیں ایک تو یہ کہ کم و بیش حذف و اضافے اور بعض دوسرے جزئی تصرفات کی آزادی کے ساتھ اصل کتاب کے نفس و مرکزی مطالب کو مجموعی حیثیت سے قائم رکھا جائے اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اصل مطلب کو ضبط کیے بغیر اور معمولی تصرف کیا جائے (۵)۔

دہلی کالج، دہلی میں ترجمے کے جو اصول وضع کیے گئے، ان میں یہ اصول بھی شامل تھا کہ لفظ بہ لفظ ترجمہ نہ کیا جائے۔ ترجمے میں اصل مفہوم جملے کے معنی اور مطلب کو صحیح طور سے ادا کرنا ہے خواہ اس کی ساخت یا طرز ادا کیسی ہی مختلف کیوں نہ ہو(۶)۔مصنف کے اسلوب بیان کو ترجمے میں برقرار رکھنا بھی مترجم کے لیے ضروری قرار دیا گیا ہے۔سرسید احمد خان اور ان کے رفقانے ایک مقصد کے پیش نظر ادائے مطلب کو ترجیح دی اور ترجمے کے دوسرے تقاضوں کو نظر انداز کر دیا تاہم ان کے اور اس دور کے تراجم بھی مصنف کی عبارت کا لفظ بہ لفظ ترجمہ نہ تھا۔ بلکہ مفہوم اور مطالب کے ادا کرنے کو شش کی گئی (۷)۔بیسویں صدی کے ربع اول میں جو ترجمے ہوئے عبدالباری ندوی اور اور ان میں عبدالماجد دریابادی کے تراجم کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔اسی دور میں مولانا گیلانی کی نگارشات سامنے آنا شروع ہوئیں۔مولانا گیلانی کے تصنیف و تالیف کے اولین نقوش الرشید اور القاسم میں نظر آتے ہیں۔

انہوں نے درج ذیل عربی کتب کا اردو میں ترجمہ بھی کیا:

۱۔ عبقات تصنیف: شاہ اسماعیل شہید

۲۔ اسفار اربعہ تصنیف: صدرالدین شیرازی

ان تحریروں میں بعض مضامین تبصرے کے انداز میں ہیں، اور اکثر مضامین ترجمے کی ذیل میں آئے ہیں۔ان مضامین کا زمانہ تحریر پہلی جنگ عظیم کے دوران کا زمانہ ہے۔اس زمانے میں دارالعلوم دیوبند میں مقیم تھے اور دونوں رسالوں الرشید اور القاسم میں ان کی تحریریں شائع ہوئی تھیں۔مضامین کی تحریر و تسوید کے وقت مولانا دارالعلوم میں ایک استاد کی حیثیت سے مقیم تھے۔مطالعہ کی عادت تھی اس لیے مختلف ممالک کی مطبوعات پڑھتے رہتے تھے۔ان کی زبان اور اسلوب پر روایتی ترجمے کا اسلوب اور رجحان موجود ہے۔عربی اور فارسی جملوں کی ساخت کے مطابق بعض اوقات اردو ترجمہ بھی اسی ترتیب اور ساخت کے مطابق کرتے ہیں۔ایک مقام پر لکھتے ہیں:

> ''کسی جگہ، کسی مکان میں اگر تم سے اپنے مالک کی نافرمانی ہوگئی ہو، تو نہ ٹلو وہاں سے مگر اس وقت کہ اسی جگہ، اپنے پروردگار کو پکار لو'' (۸)

اس عبارت میں 'نہ ٹلو' قدیم طرز کا ترجمہ ہے اسی کے ساتھ مزید لکھتے ہیں:

> ''اس کے آگے رو لو، اسے پوج لو، آسمانی خبروں میں بتایا گیا ہے کہ جب خداوند تعالیٰ اپنے تخت جلال و جبروت پر انصاف کے لیے بیٹھے گا تو مکان و مواضع بھی تم پر گواہیاں دیں گے، پھر ایسا کیوں نہیں کرتے کہ جہاں وہ تمہاری برائیاں بیان کریں گے، موقع دو کہ وہ نیکیاں بھی ظاہر کریں اور یہی نہیں بلکہ کوشش کرو کہ تمہارا یہ معاملہ ہر اس چیز کے ساتھ جو تم سے الگ ہونے والی ہے یہ نہ ہو کہ وہ صرف تمہاری بدیوں کی

گواہ ہو'' (۹)

اس عبارت میں بھی 'نہ ہو' مبادا کا ترجمہ، اس قدیم اسلوب کا نمونہ جب عربی فارسی سے ترجمے کا اسلوب اور جملوں کی ساخت انھی زبانوں کی مانند تھی، فارسی میں لکھا ہوتا کہ ''رفتن حائم طائی رارائے مدد کردن مردے کہ در چاہ گرفتار بود۔ اور ترجمہ یہ ہوتا تھا:

''جانا حاتم طائی کا واسطے مدد کرنے ایک آدمی کی، تھا جو پڑا کنویں میں''

قرآن مجید کے لفظی ترجموں کا بھی یہی انداز تھا۔

﴿ الٓمّٓ ذٰلِکَ الکِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْہِ، ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ ﴾(۱۰)

شاہ رفیع الدین نے.....ان آیات کا ترجمہ یہ کیا:

''یہ کتاب نہیں شک بیچ اس کے راہ دکھاتی ہے واسطے پرہیزگاروں کے''

سورۂ اخلاص کی اس آیت کا ترجمہ بھی نمونہ کے طور پر درج کیا جاتا ہے:

﴿قُل ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ﴾ ''کہہ اے محمدؐ وہ اللہ ایک ہے'' (۱۱)

مضمون کے ابتدائی محولہ جملوں میں اگرچہ قدامت کا رنگ جھلکتا ہے۔ لیکن ان میں جملے کی ترکیب اور ساخت میں ،مرکب جملے کی صفات موجود ہیں، حروف عطف، مرکبات اور افعال واسماء اردو ترکیب کے مطابق موجود ہیں۔

اسی مضمون میں قرآن مجید کی ایک آیت کا ترجمہ اس طرح کیا ہے:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَکْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ سَیَدْخُلُوْنَ جَھَنَّمَ دٰخِرِیْنَ ﴾(۱۲)

مولانا گیلانیؒ نے اس کا ترجمہ اپنے اسلوب کے مطابق یہ کیا ہے:

''جو مجھ سے دعا کرنے میں اکڑتے ہیں، جہنم میں ذلیل ہو کر گھسیں گے'' (۱۳)

اس ترجمے میں یستکبرون کا ترجمہ ''اکڑتے'' کیا ہے۔ ہم یہاں اس سے پہلے ہونے والے اس آیت کے چند ترجمے نقل کرتے ہیں:

''اس ترجمے میں تحقیق وہ لوگ کہ ''تکبر'' کرتے ہیں عبادت میری سے، شتاب داخل ہوں گے دوزخ میں ذلیل ہو کر'' (۱۴)

''اس ترجمے میں بے شک جو لوگ ''بڑائی'' کرتے ہیں میری بندگی سے، اب بیٹھیں گے دوزخ میں ذلیل ہو کر'' (۱۵)

''اس ترجمے میں جو لوگ مارے ''غرور'' کے ہماری عبادت سے سرتابی کرتے ہیں عنقریب (مرے پیچھے ذلیل و) خوار ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے'' (۱۶)

''اس ترجمے میں جولوگ میری عبادت سے سرتابی کرتے ہیں، وہ عنقریب (مرتے ہی) ذلیل ہوکر جہنم میں داخل ہوں گے'' (۱۷)

اسی لفظ کا ترجمہ مولانا گیلانیؒ نے اگلے ہی صفحے پر یہ بھی کیا ہے: وہ انکساری سے نہی جھکتا، بلکہ ''تنتا'' ہے۔ دونوں جگہ انھوں نے یستکبرون کا ترجمہ ہندی الفاظ میں کیا ہے عربی، فارسی کے الفاظ ترجمے کے طور پر استعمال نہیں کیے یعنی: اکڑتا، تنتا ہے۔ باقی مترجمین نے عربی اور فارسی کے متبادل الفاظ استعمال کیے ہیں یعنی ''تکبر'' اور ''سرتابی'' اسی مضمون کے آخر میں آیت کے ترجمے میں یہی اسلوب اختیار کیا ہے:

''ان الحسنات یذھبن السئیات'' کا ترجمہ کیا ہے، نیکیاں برائیوں کو لے اڑتی ہیں۔ (۱۸)

یذھبن کا ترجمہ ''لے اڑتی ہیں'' کیا گیا ہے۔ ان کی بعد کی تحریروں میں بھی یہی انداز ہے کہ عربی فارسی کے الفاظ کی جگہ ترجموں میں اردو، ہندی اور بعض اوقات بہاری زبان کے مقامی ہندی آمیز الفاظ استعمال کرتے۔ مولانا کے ان مضامین میں روانی سلاست اور بے تکلفی موجود ہے۔ ایک پیراگراف نمونے کے لیے نقل کیا جاتا ہے:

''ایک بادشاہ اپنی رعایا کی آبادیوں میں ریل و تار برقی، جاری کرتا ہے۔ آلات کشاورزی مہیا کر دیتا ہے ڈاک خانے مستقشفے (ہسپتال) کھول دیتا ہے۔ الغرض رعایا کے آرام وعیش کے لیے جتنی چیزیں ضروری ہیں، وہ ان تمام اشیا کو اکٹھی کر کے اذن عام دیتا ہے کہ جس کا جی چاہے اس سے فائدہ حاصل کرے۔ اب فرض کرو اس میں بعض لوگ ایسے ہیں جو ریل پر سوار ہونے کی قسم کھاتے ہیں۔ سلطنت کے تمام رفاہات عامہ سے منہ موڑ لیتے ہیں..... پھر کیا اس جماعت سے سلطنت ایک منٹ کے لیے بھی راضی رہ سکتی ہے یا کم از کم ان کا اعراض مدح سرائی کا مستحق ٹھیر سکتا ہے؟ بجز نہیں کہ اس کا اور کیا جواب ہوگا۔ پھر اسی طرح جب کہ خداوند قدیر نے اپنے بندوں کی بستیوں میں مختلف آثار و خواص کی چیزیں اسی لیے پیدا کی ہیں۔ فرمایا ﴿خَلَقَ لَكُمْ مَافِي الارض جميعا﴾ ''پیدا کیا تمہارے لیے جو کچھ زمین میں ہے'' (۱۹)

یہ نثر پارہ ایک مضمون کا حصہ ہے۔ ادائے مطلب میں کوئی ابہام نہیں۔ کسی قسم کی لفظی اور معنوی تعقید نہیں ہے۔ ترجمے میں مفہوم کی ترسیل اور الفاظ کا دروبست مترجم کی زبان پر گرفت اور اظہار و ابلاغ کی انتہائی صلاحیت کا غماز ہے۔ مترجم نے عبارت میں کسی قسم کا الجھاو پیدا نہیں کیا۔ روانی اور سلاست کے باوجود عبادت اکہرے پن اور سطحیت کا شکار نہیں جیسا کہ عموماً ہوتا ہے۔ بعض مترجمین کے ترجمے زبان کے اسلوب کو قائم رکھنے میں ناکام رہتے ہیں اور مشکل ادق پیچیدہ مطالب و مباحث کی وجہ سے سلاست و روانی قائم رکھنے میں ناکام رہتے ہیں۔ فلسفے اور منطق کے علاوہ معاشیات و سیاسیات کے بعض مباحث کے ترجمے

میں اردو زبان کی عربی فارسی کی ایسی ادق اصطلاحات کا سہارا لینا پڑا، جو عسیر الفہم نہ تھیں۔ مولانا گیلانیؒ کے ہاں بھی بعض تراجم اخذ کرنے میں دقت پیش نہیں آتی لیکن وہ الفاظ اور تراکیب بہر حال نامانوس اور اجنبی ضرور ہیں مثلاً: طبیب ابلہ شود، اخبار صحیحہ و آثار مستندہ، حکمائے قدیم کی زیجات، مراصد، میں اجرام علویہ (۲۰)۔

ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے تراجم میں عبارت کی عمدگی اور ابلاغ میں وضاحت وصفائی میں بتدریج بہتری پیدا ہوتی گئی۔ ابتدا میں ان کے تراجم میں ندایت کا رنگ تھا، بعد میں مروجہ زبان اور اسلوب بیان کی سادگی واضح ہوتی گئی۔ اُس زمانے میں اور بھی متعدد ادیب وانشا پرداز ترجمے کے کام میں مصروف تھے۔ علما اور دینی مدارس کے اساتذہ ہی اس کام میں مصروف نہ تھے بلکہ چوٹی کے صحافی اور سیاست دان بھی مغربی علوم اور غیر ملکی زبانوں کے تراجم پر توجہ دے رہے تھے۔ عبدالماجد دریابادی نے ۱۹۱۱ء۔۱۹۱۲ء میں ترجمے کا کام شروع کر دیا تھا (۲۱)۔ ان کے تراجم ابتداً ''الندوہ'' میں شائع ہوئے۔ ان کے تراجم کی مختصر کیفیت درج کی جاتی ہے: عبدالماجد دریابادی نے 'مکالمات برکلے'' کے عنوان سے برکلے کی کتاب

"Three Dialogues Between Hylas and Philonous in opposition to Skepties and Atheists" کا اردو ترجمہ کیا۔۲۔ دوسرا ترجمہ موسیو پال رچرڈ کی کتاب کے انگریزی ترجمے "To the Nations" کا اردو ترجمہ ہے اس کا نام ''قیام امن'' رکھا گیا۔۳۔ ناموران سائنس بھی انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے۔ ان کتب کے علاوہ متعدد مضامین اردو میں ترجمہ ہو کر شائع ہوئے۔ قرآن مجید کا انگریزی میں ترجمہ بھی ان کی مترجمانہ حیثیت کا شاہکار ہے۔ برطانیہ کے مشہور مصنف ایڈورڈ ہارٹ پول لیکی (۱۸۳۸ء۔۱۹۰۳ء) کی کتاب "History of European Morals" کا ملخص ترجمہ ''تاریخ اخلاق یورپ'' کے نام سے کیا (۱۹۱۵ء-۱۹۱۶ء) عبدالماجد دریابادی کے تراجم کی تعریف شبلی نعمانی نے بھی (۲۲)۔

ان کے ترجموں کے اسلوب کو اُس دور کے بعض دیگر ادبا نے بھی پسند کیا اور ان کی کاوشوں کی قدر کی (۲۳)۔ بعض تراکیب پر جن انشا پردازوں نے اختلاف کیا، اس پر مترجم کو اپنے ترجمے پر اصرار رہا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اتنی خود اعتمادی سے ترجمے کا کام کر رہے تھے کہ اپنے دور کے معروف اصحاب قلم سے بھی انھیں بحث وتمحیص میں کوئی تکلف نہ تھا۔ ان کا ایک مضمون الہلال ستمبر ۱۹۱۲ء میں شائع ہوا۔ اس مضمون کی بعض اصطلاحات پر مولانا ابوالکلام آزاد نے گرفت کی جس پر مترجم نے ایک ناگوار بحث کا سلسلہ شروع کر دیا، تاہم اس بحث وضع اصطلاحات اور اردو فن ترجمہ کے حوالے سے بہت عمدہ اور مفید مباحث پڑھنے کو ملے (۲۴)۔ شبلی نعمانی، سلیمان ندوی، عبدالباری ندوی، مولانا ظفر علی خان، سجاد حیدر یلدرم اور دیگر ادیبوں کے تراجم کے ساتھ مولانا گیلانیؒ کے تراجم کا تقابلی جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ مولانا گیلانی کی اس دور کی نثر ان کے بعد کے ادوار کی نثر سے بہت مختلف ہے۔ اس میں وہ جملوں کی بے ترتیبی اور طوالت نظر نہیں آتی جو بعد میں ان کی نثر کا طرۂ امتیاز بنی۔ اس دور میں مولانا آزاد کی کتاب ''مسلمان عورت'' کا ایک پیرا گراف نقل کیا جاتا ہے:

''عورتیں اور مرد دو مختلف گروہ ہیں اس لیے ان دونوں کے میدان عمل کو الگ الگ کر کے پردہ کو بیچ میں حد فاصل قرار دیا گیا۔ تاکہ ہر گروہ اپنے میدان عمل میں محدود رہے۔ اسی حد فاصل کے اٹھانے کی جب کوشش کی جاتی ہے تو تمدن و معاشرت کی بنیادوں میں حرکت پیدا ہو کر دنیا کو خبردار کر دیتی ہے کہ عنقریب عمارت گرنے والی ہے۔ اس امر کے ثبوت کے لیے کسی دلیل کی ضرورت نہیں یورپ کی موجودہ حالت کافی ہے'' (۲۵)

زیر نظر نثر پارہ فرید وجدی کی کتاب ''المراۃ المسلمہ'' کے اردو ترجمے ''مسلمان عورت'' میں سے لیا گیا ہے۔ اس کی عبارت قطعاً صدی پہلے کی نثر نظر نہیں آتی۔ اپنی سلاست، روانی اور بے تکلفانہ طرز تحریر کے باعث یہ آج کی زبان معلوم ہوتی ہے۔ کوئی مشکل پسندی نہیں۔ اظہار مدعا کا بے ساختہ پن صاف جھلک رہا ہے۔ اب ہم مولانا گیلانیؒ کے ترجمے کا ایک نثر پارہ پیش کرتے ہیں:

''یہ کلیہ ہے کہ جس عضو کے ذریعے سے ریاضت زیادہ کی جائے گی وہی زیادہ قوی اور مضبوط ہوگا۔ علی الخصوص جب کہ اس عضو سے وہی کام لیا جائے جو اس کے مناسب ہے اور اس کی تخصیص صرف اعضا ہی کے ساتھ نہیں ہے بلکہ ہر قوت کے لیے یہ حکم عام ہے۔ تم اگر قوت حافظہ بڑھانا چاہتے ہو تو اس کی آسان ترکیب یہی ہے کہ حفظ کا شغل زیادہ رکھو چند ہی دنوں میں خاصا تفاوت محسوس کرو گے، قوت فکر سے تم جس قدر کام لیتے رہو گے تمہاری سمجھ اسی قدر زیادہ دقیق، نکتہ رس ہوتی جائے گی'' (۲۶)

مولانا گیلانیؒ کے اس نثر پارے میں ادائے مطلب میں کوئی الجھاؤ، اخلاق اور ابہام نہیں ہے۔ یہ مضامین ان کی ابتدائی کاوشوں میں سے ہیں۔ تاہم اس وقت بھی ان کا اسلوب بیان سادہ اور سلیس تھا، ان کے اندر ترجمہ کرنے کی صلاحیت اور زبان کی نزاکتوں کا احساس تھا۔ اُس زمانے میں بھی ''مولویانہ'' طرز تحریر اور انداز ترجمہ رائج تھا۔ لیکن مولانا گیلانیؒ نے اس سے کامل احتراز کیا۔ مولانا عبدالباری ندوی نے ترجمے کے اصول کے طور پر لکھا ہے کہ ترجمہ کا ایک طریقہ ''مولویانہ'' ہے کہ لفظ کی جگہ لفظ اور حرف کی جگہ حرف رکھتے جاتے ہیں (۲۷)۔ مولانا گیلانی کے ترجموں میں یہ روایتی انداز تحریر نہیں ان کا اپنا اسلوب بیان ہے۔ رفتہ رفتہ جدید اسلوب تحریر انھی کے ساتھ مخصوص ہو کر رہ گیا۔ ان کے یہاں بعض اوقات ترجمہ کے ساتھ ساتھ ترجمانی بھی پائی جاتی ہے۔ یہ ترجمانی ایسی صورت اختیار نہیں کرتی جس سے مصنف کا اپنا رنگ ختم ہو جائے اور خود مترجم مصنف کی جگہ لے لے۔ انھوں نے مصنف کا جوش بیان اور گرمی جذبات کو بھی ترجمے میں قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔

مصنف شہاب محمود کی عربی عبارت کا ترجمہ کرتے ہوئے ''عمر الدنیا'' میں لکھتے ہیں:

''دنیا کب ختم ہوگی؟ زمین کسی دن برباد ہو جاوے گی؟ تارے، سورج، ماہتاب، سیارے کسی وقت ٹوٹ

کر اپنی ہستیاں نابود کر دیں گے؟ نظام عالم کے لیے وہ آخر کب آئے گا جب کہ یہ کارخانہ ہمیشہ کے لیے تباہ کر دیا جاوے گا؟ قرآن مجید ان سوالات کے جوابات میں خاموش ہے۔ اس کی آیات میں اس دن کی تعیین کا کوئی وقت خاص نہیں۔ اس نے جو کچھ کیا وہ صرف اس قدر ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے لوگوں نے پوچھا، قیامت کب ہے! خدا نے جواب میں فرمایا: ''تجھ سے پوچھتے ہیں (کہ قیامت کب ہے) گویا تم نے اس کی ٹوہ لگالی ہے۔ کہو کہ اس کا علم خدا کے نزدیک ہے، لیکن اکثر آدمی نہیں جانتے (کہ اس کا علم خدا کے ساتھ مخصوص ہے)'' (۲۸)

ترجمے کے شروع میں کسی قدر استعجابیہ انداز میں سوال پر سوال ہو رہا ہے اور مصنف کا جوش و جذبہ بڑھتا جاتا ہے۔ ترجمے میں قاری یہی کیفیت محسوس کرتا ہے۔ یہ جوش و جذبہ ترجمے میں منتقل کرنا، مترجم کی صلاحیت، استعداد اور قدرت زبان پر شاید ہے بعض تحریریں اور اسلوب ایسا ہوتا ہے کہ اس کا ترجمہ کرنا مشکل ہوتا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے ''غبار خاطر'' کی نثر کو اسی زمرے میں رکھا ہے اور کہا ہے کہ اس کتاب ''غبار خاطر'' کی نثر ایسے اسلوب بیان کی نمایندگی کرتی جس کا کسی بھی دوسری زبان میں ترجمہ نہیں کیا جا سکتا (۲۹)۔

مولانا گیلانی کے ترجموں کا ایک خاص رنگ یہ ہے کہ وہ مصنف کے بین السطور کو بھی پیش کر دیتے ہیں۔ عموماً ترجموں میں مصنف کی عبارت سے تجاوز نہیں کیا جاتا لیکن مولانا دریابادی نے اپنے ترجمے کا اسلوب بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ مضمون یا کتاب کو ایک مرتبہ پورا پڑھ لیتے ہیں۔ پھر جتنے مواد کا ترجمہ مطلوب ہوتا، اتنے حصے کا مطالعہ کر لیتے ہیں، پھر قلم برداشتہ ترجمہ شروع کر دیتے ہیں (۳۰) اس سے بعض اوقات مصنف کے مطالب میں مترجم کے خیالات داخل ہونے کا قوی امکان ہے اور قاری کو پورا ترجمہ مصنف ہی کے خیالات کا مجموعہ نظر آتا ہے حالاں کہ اس میں مترجم نے اپنے خیالات کی اچھی خاصی مقدار ڈال دی ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں قاری کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ مصنف کے خیالات کیا ہیں اور مترجم کی آمیزش کیا ہے۔ اگر مجموعی طور پر نفس مضمون مصنف کا ہو اور مترجم اسے زیادہ سے زیادہ مصنف کے الفاظ میں بیان کر دے تو ترجمہ قابلِ اعتبار اور مستند ہوگا۔ مفہوم کا ابلاغ اور مصنف کے خیالات کی آزاد ترجمانی مولانا گیلانیؒ کے ترجموں میں نظر آتی ہے۔ ترجموں میں زبان کے ساتھ ساتھ املا کا مسئلہ بھی آتا ہے جو اگر اُس دور کے عمومی رجحان اور اصولوں کی وجہ سے ہوتا ہے تاہم بیسویں صدی کی ابتدا میں نون غنہ اور دو چشمی کا مسئلہ آج کے قارئین کے لیے اجنبی ہے۔ بیسویں صدی کی ابتدا میں املا کا جو انداز تھا، آج بہت حد تک بدل چکا ہے۔ درج ذیل الفاظ اس وقت رائج تھے:

قدیم املا	جدید املا	قدیم املا	جدید املا
بتلاویں	بتائیں	ساتہہ	ساتھ
ادن سے کہا	ان سے کہا	جاویں	جائیں
جگھ	جگہ	دیکہتے	دیکھتے
دہمکی	دھمکی	کچہ	کچھ (۳۱)

الفاظ کا قدیم املا، مولانا گیلانیؒ اور دوسرے ادیبوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ یہی حال روزمرہ اور محاورات کا بھی ہے کہ مختلف ادوار میں وقت کے ساتھ ساتھ محاورات اور روزمرہ میں تبدیلیاں آتی گئیں۔ ڈپٹی نذیر احمد کے دور میں دہلی کا محاورہ اور روزمرہ آج بہت حد تک بدل چکا ہے: چرخ کھانا۔ بڑھے چڑھے۔ تار باندھ کر کھڑے ہونا۔ مولانا گیلانی کے ترجموں میں انگریزی الفاظ بھی استعمال ہوتے ہیں۔ وہ اگرچہ مدارس کے فارغ التحصیل تھے تاہم ان کی نثر میں اس دور کے علما کی عام روایت کے برعکس انگریزی الفاظ بھی بے تکلف استعمال میں آجاتے ہیں۔ ٹائیٹل پیج، پریس، معریٰ ایڈیشن، سیکنڈ، ہسپتال، ریل، منٹ وغیرہ (۳۲) نون غنہ بھی مفقود ہے: ''چمن کے پودون کے تھوہڑ کے جنگلوں کو سینچا جائے'' (۳۳)۔

یہ مضامین ۱۹۱۶ء اور ۱۹۱۷ء میں ''ماہنامہ الرشید'' اور ''القاسم'' میں لکھے گئے۔ ان مضامین کی مجموعی فضا دینی ہے۔ چند مضامین سائنسی معلومات کے حامل ہیں۔ یہ مضامین عربی سے اردو میں منتقل ہوئے ہیں۔ جس زمانے میں یہ لکھے گئے اور ترجمہ کے اس وقت دینی علما کا عمومی رجحان مغربی علوم کی طرف زیادہ نہیں تھا تاہم انگریزی کتاب کے ترجمے انہی علما کے قلم سے اتنے زیادہ نہیں جتنے عربی کتابوں کے تراجم اردو میں کیے گئے۔ عربی کتابوں کے مصنف مغربی علوم سے واقفیت کی بنا پر مغربی علمی اصطلاحات کو عربی میں لا چکے تھے عربی کتب میں مغربی علوم کے متعلق جس قدر معلومات تھیں ہندوستان کے علما نے انھیں ترجمہ کرتے وقت اور تصنیف و تالیف کی دیگر ضروریات میں استعمال کیا۔ انگریزی اتنی نہ جانتے تھے کہ وہ براہ راست انگریزی کتابوں سے استفادہ کرتے لہٰذا انھیں عربی کتب پر انحصار کرنا پڑا۔ بعض عرب مصنفین بھی انگریزی اور دیگر یورپین زبانوں سے اتنے واقف نہ تھے۔ اس لیے انھوں نے نقل در نقل کے عمل کو آزمایا اور عربی کتابوں سے جب یہ معلومات اردو میں ترجمہ ہوتیں تو حقیقت معلوم ہوتی کہ انگریزی زبان کی یہ علمی سوغات عربی میں صحیح طور پر منتقل نہ ہوئی تھی، اردو مترجمین جنھیں براہ راست انگریزی سے ربط و تعلق نہ تھا، عربی کتب کے مندرجات کو معتبر سمجھ کر اپنی کتابوں میں ترجمہ کرتے رہے جس سے شبلی نعمانی جیسے محقق کو بھی کئی مقامات پر ٹھوکریں کھانا پڑیں (۳۴) انھوں نے فرید وجدی کی عربی کتابوں سے اپنی کتاب ''الکلام'' میں بعض انگریز مفکرین کے اقوال نقل کیے تھے۔ فرید وجدی خود انگریزی زبان کے ماہر نہ تھے، انھوں نے ایک اور معاصر مصری مصنف کی کتاب مغربی مفکرین کی آرا نقل کی تھیں جو براہ راست انگریزی سے ناواقفیت کے باعث غلط ترجمہ ہو کر جزو کتاب بن گئی تھیں۔ چنانچہ عبدالماجد

دریابادی نے اسی بنا پر شبلی کی ،الکلام،کو تصنیف تو کیا تالیف ماننے سے بھی انکار کر دیا تھا(۳۵)۔

مولانا گیلانیؒ کے تراجم میں بعض مقامات پر مغربی افکار سے نبرد آزمائی نظر آتی ہے یہ اُس دور کا علمی و دینی منظر نامہ تھا۔ جس سے مشرقی اہل علم خصوصاً علما کے طبقے کی طرف سے مغربی افکار و نظریات پر تنقید ہوتی تھی اور مشرقی علوم وفنون تہذیب و ثقافت اور سیاست، اخلاقیات کی برتری کو اجاگر کیا جاتا تھا،مسلمانوں کی طرف سے مغربی افکار اور مغربی تہذیب وتمدن کی مخالفت کا رجحان ۱۸۵۷ء کے بعد شروع ہو گیا تھا۔ایک گروہ سرسید کی پیروی مغربی کی تائید میں تھا اور دوسرا گروہ مغرب پر تنقید کی وجہ سے معرض وجود میں آ گیا۔ ہر چند کہ اس کی قیادت علماء کے ہاتھ میں تھی تاہم اس میں اکبرالہ آبادی،شبلی نعمانی،علامہ اقبال اور دیگر جدید تعلیم یافتہ دانش ور شامل تھے۔اس فکری و ذہنی کشمکش کے دور میں ادبیات میں بھی یہ دونوں گروہ حریفانہ محاذ آرائی میں سرگرم عمل نظر آتے ہیں۔مغرب پسند طبقے ہی میں سے بعد ازاں ترقی پسند تحریک کے ادیب اور شاعر منظر عام پر آئے اسی گروہ میں سے اشتراکیت کے علم بردار دانش ور علمی و ادبی فضا پر ایک وقت تک چھائے رہے۔نظم ونثر میں اس نظریاتی کشمکش کے اثرات واضح ہوتے تو دینی طبقے میں بھی تفریق پیدا ہوتی اور ایک اچھا خاصا دینی طبقہ کانگرس کی متحدہ قومیت کا قائل تھا اور اس طبقے کے علما میں سے بعض علما اشتراکی نظریات کے بھی جزواً قائل تھے ان کی تحریروں میں اس کے اثرات ہی نہیں بلکہ اس کی تعریف وتحسین بھی ہونے لگی(۳۶)۔عبدالماجد دریابادی ایک مدت تک دین و مذہب کے خلاف لکھتے رہے یہاں تک لکھ گئے کہ مذہب چند روز کا مہمان ہے جس طرح آفتاب علم کے سامنے توہمات کی تاریکی دور ہو جاتی ہے اسی طرح جوں جوں سائنس کی تعلیم عام ہوتی جائے گی اسی نسبت سے مذہب کا اثر بھی زائل ہوتا جائے گا(۳۷)۔فکر ونظر کے اس متلاطم عہد انقلاب میں اردو نظم ونثر میں بھی بہت سے تغیرات پیدا ہوئے۔مولانا گیلانیؒ کے مضامین تراجم پہلی جنگ عظیم کے دوران میں منظر عام پر آنا شروع ہوئے ان میں بھی عربی مصنفین کی کتابوں اور مضامین کا ترجمہ غالب تھا۔انگریزی سے وہ اس وقت تک ناواقف تھے تاہم عمومی فضا چوں کہ مغربی علوم وفنون اور تہذیب وتمدن کے مخالف تھی اس لیے مولانا گیلانیؒ بھی اس فضا میں دینی علما کے گروہ سے متعلق ہونے کے باعث تراجم میں بھی انھی کے پیروکار تھے۔جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن کی ملازمت کے دوران ان میں فکر ونظر کی وسعت اور تنقیدی بلند نظری پیدا ہوتی۔جامعہ عثمانیہ کے ماحول میں جدید علوم وفنون کی فضا نے انھیں بھی مغربی افکار سے واقفیت کا موقع فراہم کر دیا۔ چنانچہ اس دور میں ان کی تصانیف میں راویتی فکر کے ساتھ ساتھ جدید فکر سے ہم آہنگی کا میلان ورجحان پیدا ہونے لگا۔ان کے اسلوب نگارش میں رفتہ رفتہ پختگی آنے لگی،معلومات کی فراوانی اور طبعی وارفتگی نے ان کے اسلوب تحریر پر یہ اثر ڈالا کہ جملے طویل ہونے لگے زیر بحث موضوع سے متعلق کثیر معلومات بھی قلم سے نکلنے لگیں۔یہاں تک کہ مرکزی خیال کا رشتہ ہاتھ سے نکل گیا اور یوں ان کی تحریر غیر متعلق مواد سے بھی گراں بار ہونے لگی۔

الرشید والقاسم میں مضامین کی اشاعت کے کچھ ہی عرصے بعد انہیں معارف میں مضامین نویسی کا موقع ملا۔جون ۱۹۲۰ء

میں ان کا مضمون ''سورہ یوسف کے ایک واقعہ کی تفسیر'' شائع ہوا۔ یہ مضمون نواب حبیب الرحمٰن خان شروانی کے اسی موضوع سے متعلق ایک مضمون کے جواب میں تحریر کی گیا تاہم اس مضمون کو مولانا گیلانیؒ نے شروانی کے مضمون کا تکملہ لکھا ہے۔ اس مضمون میں گیلانی کا اسلوب تحریر پہلے کی نسبت اور زیادہ واضح اور پختہ ہو گیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''عقلی اور ذہنی اعتبار سے اس قصے میں جتنی الجھنیں پیدا کی گئی تھیں اس میں کوئی شبہ نہیں، کہ تبصرہ شیروانیہ سے ان کا بالکلیہ ازالہ ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد شاید کسی اضافے کی ضرورت بھی نہیں رہی تھی لیکن چوں کہ تفسیر جدید میں بعض قرآنی قرائن سے تائید حاصل کرنے کی کوشش کی گئی ہے ہم چاہتے ہیں کہ اس کا بھی فیصلہ کر دیا جائے اور پھر دکھا دیا جائے کہ خصوصی اشارات بھی واقعہ کی کسی شکل کی تائید کرتے ہیں'' (۳۸)

محولہ عبارت کس قدر صاف، واضح اور سلیس ہے ان کے ابتدائی مضامین کی نسبت اس میں زیادہ پختگی ہے۔ مولانا گیلانیؒ کے مضامین ان کی لسانی مہارت، وسعت مطالعہ اور انشاء پردانی کی شان لیے ہوتے ہیں۔ ان کی زبان و بیان معاصر ادیبوں کی لسانی خوبیوں کی جامع ہے۔ ان کے ہاں بعد میں طویل نویسی کا رجحان پیدا ہو گیا تھا لیکن ابتدائی زمانے میں مدعا نگاری اور صرف موضوع تک محدود رہنے کا میلان ہے۔ استدلال اور زور بیان کے لحاظ سے ان کی نثر معاصر ادیبوں کا مقابلہ کرتی ہے۔ اشعار کا استعمال اور ادبیت کی شان بھی ان کی تحریروں میں موجود ہے۔ بعض تلمیحات قاری کے لیے عسیر الفہم ہوتی ہیں تاہم سیاق و سباق سے عبارت کی تفہیم مشکل نہیں رہتی۔ ہم ان کے ترجمہ کردہ مضامین کے بارے میں کہہ سکتے ہیں کہ یہ مضامین ہر لحاظ سے اردو زبان کی لسانی خوبیوں کے حامل ہیں ان سے ترجمے کی روایت کو فروغ حاصل ہوا۔ آئندہ سطور میں ہم ان کی ترجمہ کردہ کتابوں کا جائزہ لیں گے۔ مولانا گیلانی نے صدرالدین شیرازی کی کتاب ''اسفار اربعہ'' کے کچھ حصوں کا ترجمہ کیا۔ ترجمے کی مطبوعہ کتاب میں انھی کا نام لکھا ہوا ہے۔ تاہم ابوسلمان شاہجہانپوری نے لکھا ہے:

''مولانا (گیلانی) اس کے شریک مترجم ہیں، پورا ترجمہ ان کی کاوش کا نتیجہ نہیں'' (۳۹)

اس دعوے میں شریک مترجم کا نام دیا جانا چاہیے تھا کہ یہاں یہ بھی نہیں بتایا گیا کہ شیرازی کی کتاب ''اسفار اربعہ'' کے کسی حصے کا ترجمہ مولانا گیلانی نے کیا اور کسی حصے کا ترجمہ شریک مترجم نے کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ صدر الدین شیرازی کی کتاب "الحکمة المتعالية فی الاسفار العقلية" میں چار اسفار ہیں۔ پہلے دو اسفار کا ترجمہ مولانا گیلانیؒ نے کیا اور آخری دو اسفار کا ترجمہ سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے کیا (۴۰)۔ سید مودودیؒ کا یہ ترجمہ شائع نہیں ہوا۔ سید مودودیؒ کا یہ ترجمہ ساڑھے تین ہزار صفحات پر محیط تھا۔ مولانا نے یہ ترجمہ آٹھ ماہ میں مکمل کیا (۴۱) مولانا گیلانیؒ نے اسفار اربعہ کے پہلے اور دوسرے سفر کا ترجمہ کیا اور اس کی جلد اول کا پہلا حصہ جامعہ عثمانیہ حیدر آباد (دکن) کی طرف سے ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا۔

مولانا گیلانیؒ نے اس کتاب میں فلاسفہ کی اصطلاحات استعمال کی ہیں۔ لیکن عبارت میں روانی اور تسلسل برقرار رکھا

ہے۔زبان وبیان میں غریب الفاظ سے پرہیز کیا گیا ہے۔صدرالدین شیرازی کی یہ فلسفیانہ مباحث پر مبنی کتاب دینی مدارس کے نصاب میں شامل رہی ہے۔مسلمانوں کے فلسفیوں میں ملاّ صدرا کی ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔وہ ہر چند کہ فلسفی تھے لیکن انحراف وبغاوت سے محفوظ رہے۔ان کا فکری دبستان آج تک قائم ہے۔وہ اپنی زندگی میں بعض علمائے ظاہری کی مخالفت کا نشانہ بنے۔انھیں عرفان وحکمت سے خصوصی لگاؤ تھا۔انھوں نے خوب محنت سے مکتبی تعلیم حاصل کی۔بعدازاں انھوں نے مراقبہ اور مشاہدہ کے لیے گوشہ نشینی اختیار کی۔روحانیت کے مراتب حاصل کر کے وہ واپس شیراز آئے۔جوعرصہ انھوں نے تنہائی اور خلوت وریاضت میں گزارا اس میں وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ اثبات حقیقت کے لیے استدلال اور برہان کافی نہیں بلکہ ضروری ہے کہ استدلال کے ساتھ شہود واشراق کی بھی آمیزش ہو(۴۲)۔ان کی تمام کتابوں کا مرکزی خیال یہی ہے کہ استدلال، وحی اور عرفان کی باہمی مطابقت واتفاق پر نظریات کی بنیاد ہو۔وہ اپنے طالب علمی کے دور میں معقولات میں بہت زیادہ منہمک رہے بعد میں جب قم کے قریب سات برس (یا پندرہ برس) ریاضت میں بسر کیے تو اتنی شدت سے عرفان ومشاہدے اور تہذیب نفس کے قائل ہوتے گئے۔انھوں نے جو خاص مسائل، حکمت کی روایت میں داخل کیے وہ یہ ہیں:

۱۔ اصالت و وحدت، مراتب (تنزلات) وجود، حرکت جوہریہ، اتحاد عاقل ومعقول، تجرد قوت خیالیہ، اثبات مُثل (افلاطونی) اور صور عقلیہ خیالیہ یا برزخیہ

ان کے نزدیک واجب الوجود سے لے کر ہیولیٰ تک حقیقت واحد ہے۔ملاّ صدرا، وجود کو ایک واحد اور اصلی حقیقت قرار دیتے ہیں جو وحدت کے ساتھ تنزلات متعددہ کے قابل ہے۔وہ جوہر کو بھی متحرک قرار دیتے ہیں یعنی تمام وجود کمال کی طرف ایک صعودی قوس طے کرنے میں مصروف ہیں۔ہر وجود، ہر لحظہ ایک نئی صورت اور نیا کمال حاصل کرتا ہے۔عالم کے حدوث زبانی اور معاد جسمانی کو فلاسفہ متقدمین قرآنی تعلیمات کے مطابق حل نہ کر سکے تھے۔ملاّ صدرا نے اپنے اصول کے مطابق ان مسائل کو قرآنی تعلیمات کے مطابق حل کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ان کے نزدیک جوہر عقلی کے علاوہ قوت متخیلہ بھی مجرد ہے جوہر ہے۔متقدمین کے نزدیک جوہر عقلی ہی مجرد قائم بالذات ہے۔ملاّ صدرا کے دوسرے نظریات یہ ہیں۔انسان کے نفس میں قوت خلاّقیت، وحدت نفس، تمام اشیا کی اشرف اور بسیط حقیقت کا امکان، اتحاد عاقل ومعقول، عالم بالا میں نوری وعقلی صورتوں کا اثبات، انہوں نے ان افکار ونظریات کو باقاعدہ فلسفیانہ انداز میں سلسلہ حکمت اسلامی میں پہلی مرتبہ پیش کیا(۴۳)۔اس طرح فلسفے کا ایک ایسا مکتب قائم ہو گیا جو اس وقت تک اسلام میں عقل وفکر کے عروج اور ترقی کی آخری منزل قرار پایا ہے اور اب تک اپنی حیات اور قوت باطنی وعقلی کو محفوظ اور برقرار رکھے ہوئے ہے۔علامہ اقبال کے خیال میں محمد علی باب، عالم حقیقت کو سمجھتا تھا جس میں جوہر وعرض کا کوئی امتیاز نہیں، وہ ملاّ صدرا کے عالم ومعلوم کی عینیت کے نظریے سے گزر کر اس کے اس تصور کی طرف جاتا ہے کہ حقیقت ارادہ اور محبت ہے اور علم ارادہ ہے وجود، معروف ہے اور معروف علم کا جوہر ہے ملاصدرا کے نزدیک حقیقت تمام

اشیا ہے، پھر بھی وہ ان میں سے کوئی شے نہیں۔ صحیح علم موضوع و معروض کی حیثیت پر مشتمل ہے (۴۴)۔ اقبال اس پر تنقید کرتا ہے کہ ملا صدرا کا یہ نظریہ مکمل وحدت کی طرف ایک قدم ہے۔ بابی مذہب کی مابعد الطبیعات کا ماخذ ملا صدرا کا یہی فلسفہ معروض و موضوع کی عینیت ہے۔ ملا صدرا کو جو روشنی گوشہ ریاضت میں حاصل ہوئی اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''قطع تعلق و گمنامی خاموشی و گوشہ گزینی کے ان حالات میں جب ایک مدت تک میں پڑا رہا اور اس پر ایک زمانہ گزر گیا تو دوام ریاضت و مجاہدے سے بالآخر میری روح ایک نورانی کیفیت کے ساتھ بھبھک اٹھی اور دل ایک قوی روشنی سے چمک اٹھا جس کی بدولت ملکوت کے انوار کی بارش مجھ پر ہونے لگی اور جبروت کے اسرار و دقائق کی میرا قلب منزل گاہ بن گیا احدی روشنیوں سے جگمگا اٹھا۔ الٰہی الطاف و عنایات نے میری خبر لی۔ میں ان کیفیتوں کے طفیل میں ان رموز اور نکات سے واقف ہوا جن سے اب تک جاہل تھا۔ مجھ پر برہان اور دلیل کے ساتھ ایسی باتیں کھلیں جو اب تک ایسی انکشافی کیفیت کے ساتھ کبھی نہیں کھلی تھیں'' (۴۵)

اس تجربے مشاہدے اور عارفانہ شعور کے حصول کے بعد وہ ان روشنیوں کو دوسروں تک پہنچانے کا اشارہ پا کر تصنیف و تالیف کی طرف متوجہ ہوئے۔ انھوں نے اولیا کرام اور عارفین کے اس روحانی سفر کے چار درجے مقرر کیے، لکھتے ہیں:

''عارفین اور اولیا کی راہ پر جو چلے ہیں، ان کے چار سفر ہیں، پہلا سفر وہ ہے جو مخلوقات سے شروع ہوتا ہے، اور حق پر ختم ہوتا ہے اور دوسرا سفر وہ ہے جو حق کے ساتھ حق میں ہوتا ہے۔ تیسرا سفر پہلے سفر کا مدِّ مقابل ہے کیوں کہ اس میں حق سے خلق کی طرف حق کے ساتھ سفر کیا جاتا ہے۔ اور چوتھا سفر دوسرے سفر کا ایک طریقے سے مدِّ مقابل ہے کیوں کہ یہ سفرِ حق کے ساتھ خلق میں کیا جاتا ہے..... اس لیے میں نے اپنی کتاب کو چار سفروں پر مرتب کیا ہے'' (۴۶)

ترجمے کے ان نثر پاروں سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا گیلانیؒ فلسفیانہ مباحث کی پیچیدگیوں سے کس گہرائی میں جا کر واقفیت رکھتے ہیں قاری قطعاً محسوس نہیں کرتا کہ وہ کسی کتاب کا ترجمہ پڑھ رہا ہے۔ ایک رواں ندی کی طرح ترجمہ اسے بہائے لیے جا رہا ہے۔ ترجمے کی سلاست اُسے رکنے نہیں دیتی۔ مفہوم و معنی کا بہاؤ اُسے ٹھہرنے نہیں دیتا، ابلاغ و اظہار کے لیے موزوں ترین الفاظ قاری کو کسی ابہام کا شکار نہیں ہونے دیتے۔ موضوع پر گرفت اور اُسے سمجھانے کے اسلوب سے کما حقہ واقفیت، قاری کو فلسفیانہ مباحث کے دقیق نکات کے مطالعے میں دلچسپی پیدا کر کے، اس کے انہماک اور دل جمعی کو برقرار رکھتی ہے۔ کہیں تھکن کا احساس پیدا نہیں ہونے دیتی۔ قارئین کے لیے منطق و فلسفے کے دقیق اور پیچیدہ مباحث پر کشش ہیں رہتے اس کے جتنے بھی اسباب ہوں، ملّا صدرا کی فلسفیانہ مباحث کی کتابوں میں موجود ہیں ظاہر ہے فلسفے کے مباحث کوئی قصہ کہانی اور داستانی کوائف تو

نہیں ہوتے ان میں عقل وفکر اور تفکر وتدبر کی ضرورت ہوتی ہے، دل ودماغ کی یک سوئی کے ساتھ ساتھ توجہ کو مرتکز رکھنا ضروری ہے یہ سب امور تب بخوبی سرانجام پاتے ہیں جب موضوع میں دلچسپی کا عنصر ہو اور اسلوب نگارش ایسا دل کش ہو کہ قاری مطالعے سے گریز نہ کر سکے۔ فلسفیانہ مباحث پر مشتمل کتب کے عسیر الفہم ہونے کی شکایت عام ہے اور مترجمین و مصنفین کو یہ عذر کہ اتنے مشکل مضامین کو ادا کرنے کے لیے آسان الفاظ دستیاب نہیں اور یہ فلسفیانہ مضامین آسان زبان کے متحمل بھی نہیں ہو سکتے۔ ایسے لوگ جو مشکل زبان، فلسفیانہ مضامین کے لیے ناگزیر سمجھتے ہیں شاید حق بجانب ہوں لیکن ایسے مصنفین موجود ہیں اور ایسے مترجمین کی کاوشیں بھی موجود ہیں جو آسان سے آسان زبان میں مشکل سے مشکل مضمون بیان کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ مترجم کی زبان و بیان پر قدرت ہی اُسے مفہوم کو سہل بنانے کے لیے کافی ہے۔ جب مترجم کے پاس وافر ذخیرہ الفاظ ہو، تراکیب و مترادفات سے واقف ہو، اسے استعارات اور تشبیہات کے موقع ومحل کے مطابق استعمال کا سلیقہ ہو، وہ متبادل ومتضاد الفاظ کے استعمال کو بخوبی جانتا ہو، زیر ترجمہ موضوع بھی اس کی دلچسپی کا مرکز ہو، تو وہ عام فہم زبان میں اظہار وابلاغ میں یقیناً کامیاب ہوگا۔

مولانا گیلانیؒ کے پاس عربی فارسی اور اردو کے الفاظ کی فراوانی ہے، وہ علم بیان اور فصاحت و بلاغت کے اصول وقواعد سے واقف ہیں، عربی ادب کی غواصی کر چکے ہیں، اردو ادبیات کے زمانہ طالب علمی ہی میں رسیا ہو چکے تھے (۴۷)۔ اردو ترجمے میں دل کش اور دل چسپی پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ مولانا عبدالماجد دریابادی جنھوں نے خود متعدد کتابوں کے ترجمے کیے، مولانا گیلانیؒ کے اسلوب نگارش کے بارے میں لکھتے ہیں۔

> ''قوت تحریر کا جو ملکہ مولانا گیلانیؒ کو حاصل تھا، اس کے ناظرین صدق جدید نا آشنا نہیں، ایک خاص طرز انشا کے مالک تھے۔ اور اس میں کسی کے مقلد نہیں۔ خود اس کے موجد تھے، تحریر کا سب سے بڑا وصف بے ساختگی اور برجستگی تھی، جب اور جس موضوع پر قلم اٹھایا بس لکھتے ہی چلے گئے۔ جو عنوان دوسروں کو فضول نظر آتے تھے ان میں بھی وہ نئے نئے نکتوں کے انبار لگا دیتے۔ خشکی ان کا قلم جانتا ہی نہ تھا۔ تحریر کی سطر سطر جان دار ہوتی'' (۴۸)

مولانا گیلانیؒ کے اسفار اربعہ کے ترجمے پر عبدالماجد دریابادی کی یہ تعریف صادق آتی ہے فلسفیانہ مضامین کی ایسی دقیق کتاب کا ترجمہ اس سلاست وروانی سے کیا ہے کہ فارسی کے مطالعے کا تسلسل ٹوٹتا نہیں اور اس کی دلچسپی بڑھتی ہی جاتی ہے۔ عبدالماجد نے انگریزی سے اردو ترجمہ کرتے ہوئے جس مہارت، اور لسانی گرفت کا ثبوت دیا تھا، اس کی تعریف کرتے ہوئے ایک نقاد نے لکھا ہے:

> ''ماجد نے مکالمات کا ترجمہ کرتے ہوئے مکالماتی فضا کو برقرار رکھا ہے۔ زبان کے لطف بیان کو خوبی سے اردو میں منتقل کیا ہے اور اصل متن میں شامل انشا پردازی کے چٹخارے کو بخوبی قائم رکھا ہے..... ماجد

نے دلائل کی اس شان اور چست مکالماتی فضا کو بڑی مہارت سے قائم رکھا ہے..... ماجد کے ترجمے نے اس لطافت کو کہیں مجروح نہیں ہونے دیا'' (۴۹)

اس دور کے ایک اور مترجم کی مترجمانہ مہارت کا شاہکار اس طرح ظاہر ہوا:

''اب رہا تیسرا اعتراض کہ پردہ عورتوں کو تہذیب حاصل کرنے اور علم کی تحصیل سے باز رکھتا ہے یہ بھی محض لغو اور بے معنی ہے کیوں کہ ایک لڑکی سات سال کی عمر سے لے کر بارہ سال کی عمر تک برابر مدرسہ میں رہ سکتی ہے اور ان پانچ سال کے عرصہ میں اپنی عقل کو بہت اعلیٰ درجے کی تہذیب وسلیقہ کے زیور سے آراستہ بنا سکتی ہے۔ قومی خیر خواہوں اور عالی ریفارمروں پر کوئی ناممکن بات نہیں کہ وہ تعلیم نسواں کے لیے اعلیٰ مدارس اور کالج قائم کر دیں جن میں تمام تعلیم وتربیت دینے والی کارکن عورتیں ہی عورتیں ہوں، ایسے مدارس میں لڑکیاں بے نقاب رہ سکتی ہے'' (۵۰)

ان تراجم میں بے ساختگی، بے تکلفی اور دل کش و دل چسپی موجود ہے۔ روانی اور برجستگی کی صفات موجود ہیں مولانا گیلانیؒ نے اپنے ترجموں میں یہ صفات پیدا کی ہیں: اسفار اربعہ کی جلد دوم کے حصہ اول میں لکھتے ہیں:

''انھی الفاظ میں فراست کا لفظ بھی آتا ہے آدمی کے ظاہری اخلاق وعادات سے اس کے باطنی جذبات و میلانات کا پتا چلانا اسی کا نام فراست ہے'' (۵۱)

مولانا گیلانیؒ نے ترجموں میں بعض عربی محاورات اور تراکیب کو برقرار رکھا ہے تاہم عربی متن کے ساتھ ان کا ترجمہ بھی دے دیا ہے۔ یہ وضاحتی ترجمہ کی صفت ان کی مترجمہ کتب میں عام ہے۔ اس سے قاری کو فہم مطالب میں آسانی رہتی ہے اور مصنف کا مدعا غتر بود نہیں ہوتا۔ بعض مترجمین مصنف کی عبارت کا خلاصہ ترجمے کے طور پر پیش کر دیتے ہیں اس سے ترجمانی تو ہو جاتی ہے، ترجمہ کا حق ادا نہیں ہوتا۔ مولانا گیلانیؒ کے ترجمے کا ایک نمونہ دیکھیے:

''خیال کے متعلق تو یہ عام خیال ہے، لیکن میرے نزدیک خیالی صورتیں اس عالم میں موجود نہیں ہوتیں اور نہ بدن کی قوتوں میں سے کسی قوت میں وہ منطبع اور چھپی ہوتی ہیں یعنی اہل فلسفہ میں جو یہ مشہور ہے کہ دماغ کے پچھلے حصے کو جو پہلی تحویف ہے اسی میں خیالی صورتیں منقوش اور مرتسم ہوتی ہیں۔ میرے نزدیک نہ یہ واقعہ ہے اور نہ یہ صحیح ہے جیسا کہ ارباب اشراق کہتے ہیں کہ خیالی صورتیں نفس سے جدا ہو کر مثالی مطلق کے عالم میں پائی جاتی ہیں'' (۵۲)

انھی صفات کا حامل ان کا ترجمہ عبقات ہے۔ عبقات، شاہ اسماعیل شہید کی اسلامی الٰہیات کے مباحث پر مشتمل کتاب ہے مذہب اور فلسفے کے مشترکہ افکار میں درج ذیل امور کو خصوصی اہمیت حاصل ہے:

۱۔ عالم ظاہری کی نوعیت اور ترکیب

۲۔ انسان کا اس عالم سے تعلق

۳۔ کیا یہ عالم دوامی ہے یا عارضی

۴۔ انسان کا اس عالم میں طرزِ عمل

شاہ اسماعیل شہیدؒ کی یہ کتاب ان مسائل سے بھی بحث کرتی ہے اور وجود و موجودیت سے بھی بحث کرتی ہے اس کتاب میں اعیان ثابتہ، اعیان کونیہ کے مباحث ہیں۔ مبدا التعین اور وجود ماہیت، توحید، ساری کائنات کے قیوم کی وحدت، خالق و مخلوق کا باہمی تعلق، مسئلہ وحدت الوجود، کثرتوں کے ظہور کی بحث، مجدد الف ثانی کے نظریات، شاہ ولی اللہ کے نظریات، ان عربی کے نظریات، تجلیات، ایجاب و اختیار، مراتب نفس اور مثالی کی تحقیق کے عنوان سے فلسفیانہ انداز میں بحث کی گئی ہے۔ یہ کتاب شاہ اسماعیل شہیدؒ کے اہم کتابوں میں شامل ہے۔

شاہ شہید کی یہ کتاب ''عبقات'' اُس دور کے عملی ذہن اور فلسفیانہ مباحث کی نوعیت و اہمیت کو واضح کرتی ہے۔ یہ کتاب ہندوستان کے علما کے طرز فکر اور قوت استدلال کی مظہر ہے۔ اس کتاب میں فلسفہ و تصوف مسائل و مباحث مثلاً انسان کے نفس اور موذی علوم ان کے انواع و اقسام، اعیان ثابتہ، حقائق امکانیہ، مظاہر و مبدا وجود، وجود کے انواع و اقسام پر اس درجہ دقیق و غامض کلام کہا گیا ہے کہ خود انھوں نے اس کی شرح لکھنے کا بھی ارادہ کیا تھا (۵۳)۔ مولانا گیلانیؒ نے اس کتاب کا ترجمہ اپنی زندگی کے آخری حصے میں کیا تھا۔ ترجمے کی صفات وہی ہیں جن کا ذکر ماقبل اوراق میں کیا جا چکا ہے۔ البتہ زیر نظر کتاب کے ترجمے میں ترجمے کی عبارت زیادہ واضح رواں اور شستہ ہوگئی ہے۔ ابہام مفقود ہے۔ مشکل الفاظ کا استعمال نہیں کیا گیا۔ ترجمے میں سادگی ہے۔ ترجمہ، ترجمہ معلوم نہیں ہوتا بلکہ طبع زاد کتاب معلوم ہوتی ہے۔ صدق جدید نے اس ترجمے کو سلجھا ہوا ترجمہ لکھا ہے (۵۴)۔

ترجمے کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے:

> ''باقی علم کا وہ طریقہ جس میں نامعلوم اور مجہول چیزوں کا علم معلومات کے ذریعے سے حاصل کیا جاتا ہے اس کے متعلق یہ دیکھنا چاہیے کہ معلومات سے مجہولات کی طرف آدمی کا ذہن اچانک اور دفعتاً منتقل ہوا ہے یا تدریجاً، سن بلکہ آہستہ آہستہ تدریجی طور پر یہ منتقلی عمل میں آتی ہے دوسری صورت یعنی تدریجی رفتار کے ساتھ ذہن کا معلومات سے مجہولات کی طرف منتقل ہونے کا نام نظر ہے اور جس نامعلوم بات کا علم اس طریقے سے حاصل ہوتا ہے اسے نظری کہتے ہیں'' (۵۵)

یہ ترجمہ بھی ان محاسن کا حامل ہے جو دوسرے تراجم میں موجود ہیں مفہوم کی ادائیگی، روانی اور سلاست وجود ہے۔ گیلانی مرحوم کے ترجموں میں عموماً ناہمواری محسوس نہیں ہوتی تاہم ہم کہیں کہیں مشکل الفاظ کا ستعمال بھی مجبوری کے باعث ہو جاتا ہے۔

یہ مشکل الفاظ، موقع ومحل کے مطابق ہوتے ہیں قاری پر گراں نہیں گزرتے اور عبارت کا مطلب سمجھنے میں دقت پیدا نہیں کرتے۔ یہ بھی امر واقعہ ہے کہ بعض اصطلاحات مفہوم کی ادائیگی کے لیے ناگزیر ہیں، انھیں نظر انداز کر کے خود ساختہ اصطلاحات کا استعمال جدت طرازی تو ہے لیکن ابلاغ کے لیے موزوں نہیں۔ بنی بنائی علمی اصطلاحات اور ایک طویل عرصے سے مستعمل تراکیب اگر ترجموں میں لائی جائیں تو مترجم اور قاری دونوں کے لیے مفید ہیں۔ غریب اور نامانوس تراکیب کے استعمال سے ابلاغ میں تعطل پیدا ہوتا ہے اور مصنف کی عبارت کا مفہوم قاری تک مکمل طور پر نہیں پہنچتا۔ مفہوم کی پوری ترسیل نہ ہونا مترجم کی کوتاہی ہے جس کا نقصان قاری اور مصنف دونوں کو ہوتا ہے۔ قاری کو پوری بات نہ پہنچنے سے خلجان اور غلط فہمی کا شکار ہوسکتا ہے اور مصنف کے بارے میں اس کا نقطہ نظر حد اعتدال سے تجاوز کر سکتا ہے۔ بجائے تعریف وتحسین کے قاری، مصنف کے بارے میں غلط رائے قائم کر کے غلط تاثر دے سکتا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ترجمہ، مترجم کی کوتاہی کی وجہ سے گمراہ کن ہو جاتا ہے۔

مترجم حسن بیان کے قائم کرنے اپنی تحریر کو دل کش بنانے، عبارت آرائی کرنے اور انشا پردازی وادبیت کے جوہر دکھانے کے لیے مصنف کی عبارت اور مفہوم سے تجاوز کر کے ترجمے میں غیر ضروری اور غیر متعلق الفاظ شامل کر دے تو وہ ترجمے کا حق ادا نہیں کرتا بلکہ اس صورت میں وہ ترجمہ، ترجمہ نہیں کہلائے گا مترجم کی اپنی عبارت بن جائے گی جسے وہ مصنف کے نام سے منسوب کر دے گا۔ یہ الحاقی عبارت مصنف کا نقطہ نظر نہیں ہوگا۔ اس طرح قاری غلط فہمی کا شکار ہوگا۔ یہ صورت حال مشکل مضامین اور مخلق عبارت کے ترجموں میں پیش آتی ہے۔ مترجم کا اگر ذوق بھی اس مضمون سے مطابقت نہ رکھتا ہو تو اور بھی زیادہ مشکل پیش آئے گی۔

مولانا گیلانیؒ نے عبقات کے ترجمے میں سلاست کو قائم رکھا ہے لیکن عبارت کی سادگی اور سلاست قائم رکھنے میں، زبان وبیان کو بے کیف نہیں ہونے دیا۔ عربی عبارت کا نثر پارہ دیکھیے اور پھر ترجمہ کی روانی ملاحظہ کیجیے:

عبقہ (۱۶) مبحث الاحکام الخاصة للتجليات التفصيلية: "العالم الجسمانی كله صورة جسميه شخصية منحصرة فی غرد قائمه بذاتها غير حالة فی الهيونی عند المحققين و توهم تعدد صورة كتوهم تعدد الاجسام عند تموج البحر مع انه ليس فی نفس الامر الا جسم واحد شخصی بعض اجزائه معروض لعوارض و بعض آخر لبعض آخر و لاستدلال علی وحده الصورة الجسمية بالشخص للعالم كله مقام آخر وله صوره نوعية يسمی بطيعة الكل وهی التی تقتضی تعاقب الصور و توارد الحوادث علی الصورة الجسمية كالصورة النباتية حيث تقتضی فيضان الصورة الثمرية علی جزء

من الشجرة وصورة الوردية على جزء اخر و الصورة الورقيه على ثالث الى غير ذالک"(۵۶)

ترجمہ:''یہ سارا جسمانی عالم (جس میں جمادات، نباتات، حیوانات فلکیات وارضیات سب ہی داخل ہیں۔الگ الگ چیزیں نہیں ہیں بلکہ ایک ہی جسمانی شخصی صورت ہے جو ایک ہی فرد میں منحصر اور محدود ہے اور بذات خود وہ قائم ہے یعنی ہیولا مادے میں پیوست ہو کر یہاں صورت جسمانیہ نہیں پائی جاتی (جیسا کہ ارسطو وغیرہ کا خیال ہے) بہرحال ارباب تحقیق کا مذہب یہی ہے کہ سارا جسمانی عالم ایک شخصی وجود ہے یہ خیال کہ عالم میں متعدد ہستیاں اور صورتیں پائی جاتی ہیں یہ درحقیقت ایک وہمی خیال ہے اسی قسم کا وہی خیال جیسے بحالت طلاطم دریا میں متعدد اجسام (بصورت اندراج) نظر آتے ہیں حالانکہ واقع میں دریا کا پانی ایک واحد شخصی وجود ہے البتہ اس کے مختلف اجزاء کو مختلف عوارض چوں کہ عارضی ہوتے ہیں اس لیے تعدد کا دھوکہ ہوتا ہے۔یہ دعویٰ کہ عالم جسمانی ایک واحد شخصی وجود اور شخصی صورت ہے اس کو دلیل سے بھی ثابت کیا گیا ہے لیکن اس بحث کا مقام دوسرا ہے اور جیسے عالم ایک واحد شخص صورت ہے''

صورت ہے اسی طرح سارے عالم جسمانی کی نوعی صورت بھی ایک ہی ہے کو''طبیعۃ الکل'' بھی کہتے ہیں عالم کی صورت جسمیہ پر جو تم دیکھتے ہو کہ ایک صورت جاتی ہے اور دوسری آتی ہے یا مختلف حوادث وواقعات جو اس پر طاری ہوتے رہتے ہیں، یہ اسی نوعی صورت کا اقتضا ہے۔مثلاً نباتی صورت یہ چاہتی ہے کہ درخت کے بعض جزو پر پھل کی صورت یعنی صورت ثمریہ کا اور بعض جزو پر پھول کی صورت کا بعض زیتون کی صورت کا فیضان ہو، الغرض یوں ہی مختلف اجزا پر درخت کے جن مختلف صورتوں کا فیضان ہوتا ہے یہ صورت نباتیہ کا اقتضا ہے(۵۷)۔زیر نظر ترجمے میں مصنف کی عبارت کا لفظ بہ لفظ ترجمہ دینے کی بجائے اس کا مفہوم پیش نظر رکھ کر جملے کا ترجمہ دیا گیا ہے بعض الفاظ کا لفظی ترجمہ بھی سامنے آتا ہے جیسے صورت، جسم، شخص، ہیولیٰ، تموج البحر، معرض، صورت النباتیہ، فیضان، صورۃ الثمریۃ، والصورۃ الوردیۃ، ترجمے میں عربی کے اسلوب کو بھی برقرار رکھا ہے جملہ طویل ہے تو ترجمے میں اسے مختصر کرنے کوشش نہیں کی گئی جیسا کہ عبدالباری ندوی نے لکھا ہے کہ ترجمے میں مصنف کے اسلوب کو متاثر نہ ہونے دیا جائے۔مصنف اگر طول نویس ہے اُس کا اسلوب ترجمے میں بھی برقرار رہے لکھتے ہیں:

''پھر اگر ایک شخص میں تطویل یا تکرار واعادہ کی عادت ہے مثلاً لاک یا انشا پردازی پر قدرت نہیں حاصل مثلاً اسپنسر، یا بڑے بڑے پیچیدہ جملے لکھتا ہے مثلاً مل، تو کیا حق ہے کہ ہم اسٹائل کے ان تمام خصوصیات کو فنا کردیں۔اتنا ہی نہیں بلکہ اسٹائل کی اہمیت اس درجہ ہے کہ آج اسی اختلاف اسٹائل اور بعض اندرونی شہادتوں کی بنا پر جرمنی کے بعض محققین افلاطون کے بہت سے مکالمات کو اس کی تصنیف نہیں سمجھتے''(۵۸)

مصنف کا اسلوب بیان اس کی شخصیت کا مظہر و عکاس ہوتا ہے۔ اس کے اسلوب کی خصوصیات اس کے مزاج و کردار کو ظاہر کرتی ہیں۔ مصنف کے اسلوب بیان کی رنگینی و دل کشی اور جاذبیت و شوخی اس کی شخصیت کے متنوع پہلوؤں کی عکاسی کرتی ہیں۔ اس لیے ترجمے میں اس کے بیان کو برقرار رکھنے کوشش کی جاتی ہے۔ مولانا گیلانی کی کوشش کی ہے کہ سید شہید کے اسلوب بیان کی خصوصیات کو ترجمے میں برقرار رکھیں اور وہ اس کوشش میں بڑی حد تک کامیاب رہے ہیں۔ اس کا ترجمہ وضاحتی ترجمہ ہے تاہم انھوں نے ترجمے کے ساتھ حواشی کا بھی اہتمام کیا ہے اور نہایت قیمتی معلومات فراہم کی ہیں۔ ان کے حواشی کے اسلوب کا انداز درج حاشیے سے واضح ہوتا ہے:

''اجسام میں یہ بات جو دیکھی جاتی ہے کہ ایک صورت کو چھوڑ کر دوسری صورتیں اختیار کرتے رہتے ہیں گیہوں سے روٹی، روٹی سے خون بن کر، خون گوشت وغیرہ کی شکل اختیار کرتا رہتا ہے، اسی حال کو دیکھ کر ارسطو وغیرہ نے یہ خیال قائم کیا کہ ہر جسم کی تعمیر و دو اجزا سے ہوتی ہے، ایک جز تو وہ ہے جو بدلتا رہتا ہے، اسی کو صورت جسمیہ کہتے ہیں، دوسرا جزو وہ ہے جو ہر حال میں باقی رہتا ہے اسی کو مادہ یا ہیولیٰ کہتے ہیں۔ ہیولیٰ میں کوئی خصوصی صفت بجز اس بات کے کہ ہر حال ہر صورت ہر صفت کو وہ قبول کرے اور کوئی دوسری صفت نہیں پائی جاتی۔ اسی لیے اس کو صرف استعداد، قابلیت وہ صلاحیت کہتے ہیں لیکن اشراقی حکما اور صوفیا اس کے منکر ہیں وہ سارے عالم کو ایک واحد شخصی وجود کہتے ہیں'' (۵۹)

ترجمے کے اس حاشیے میں مترجم نے نہ صرف ترجمے کی وضاحت کر دی ہے بلکہ قاری کو فلسفے کے ایک دوسرے مکتبہ فکر کے نظریات سے بھی آگاہ کر دیا ہے۔ یوں ان کا ناقدانہ ذہن تقابلی مطالعے کے موقع سے فائدہ اٹھانے میں کامیاب ہو گیا۔ یعنی انداز کہ وہ اپنی وافر معلومات سے ترجموں میں بھی خوب کام لیتے ہیں اور اپنے طبع زاد مضامین و کتب میں تو وہ آزاد ہیں کہ سوانح کا ذکر کرتے ہوئے متعلقات سوانح کا ذکر بھی کرتے اور بات کو سوانح تک محدود نہیں رہنے دیتے بلکہ اسے تاریخ جغرافیہ الٰہیات تصوف و فلسفے کے مباحث میں پہنچا کر قاری کو تو معلومات کے ذخیرے سے معمور کر دیتے ہیں لیکن زیر بحث موضوع کا رشتہ ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے اور قاری کسی اور ہی دنیا میں پہنچ جاتا ہے۔ مولانا گیلانی نے فلسفہ و منطق خوب محنت سے پڑھا تھا، اور اس مضمون میں ان کی دلچسپی اس حد تک بڑھی ہوئی تھی کہ اساتذہ خصوصاً مدرسہ خلیلیہ (ٹونک) کے اساتذہ انھیں اسی رنگ میں رنگ دینا چاہتے تھے اور توقع رکھتے تھے کہ وہ فلسفے اور منطق کی ادق کتب درسیہ ہی پڑھائیں۔ انھیں مولانا گیلانی کی شکل میں ایک بالغ نظر فلسفی نظر آتا تھا اور ان کی توقعات تھیں کہ یہ ذی استعداد اور ذہین طالب علم حمد اللہ اور قاضی مبارک طلبہ کو پڑھائے۔ ایساغوجی اور شمس بازغہ پڑھاتے یوں ملک و ملت کو فائدہ پہنچاتے طب اور دیگر علوم پڑھنے سے پیسہ تو ہاتھ آتا ہے اس کام کے لیے دوسرے اطبا موجود ہیں، یہ منطق و فلسفہ پڑھائے تو ان کی نیک نامی ہوگی (۶۰)۔ اتنی محنت سے فلسفے کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد دیوبند کی

تعلیم نے اس پر قرآن وحدیث کے ذوق کا ایسا رنگ غالب کیا تھا کہ منطق وفلسفہ سے دل چسپی باقی نہ رہی تھی۔لیکن جب ترجمے کا مرحلہ آیا تو اسی مضمون کو کتب کا ترجمہ کیا جس میں انھیں قابل رشک کامیابی حاصل ہوتی۔ان کی ترجمہ کی ہوئی کتب بڑے شوق اور رغبت سے پڑھی گئیں۔ان عبقات کے ترجمے کی اشاعت اگرچہ ان کی وفات کے بعد ہوئی تاہم وہ اپنے اس ترجمے کی جلد اشاعت کے بہت متمنی تھے عبقات کے اردو ترجمے کے پیش لفظ میں لکھا ہے:

''مولانا گیلانیؒ کی شخصیت محتاج تعارف نہیں ہے عارف موصوف سے مجھے اس وقت مشرف نیاز سعادت فیض حاصل ہوئی جب وہ اس ترجمے کی مہم سرانجام دے چکے تھے اور اس کی اشاعت میں بڑی عجلت کے آرزومند تھے۔مگر افسوس کہ حیات نے وفا نہیں کی اور علامہ موصوف اس مہم کو سرانجام دینے کے چند ہی برس بعد واصل بحق ہوئے اور آپ کی زندگی میں اس کی اشاعت نہیں ہو پائی''(۶۱)

مولانا گیلانی کی بعض اور بھی کتابیں بھی ان کی وفات کے بعد طبع ہوئیں لیکن اس کتاب کی اشاعت کی عجلت غالباً اس لیے تھی کہ وہ اپنی فلسفیانہ طرز فکر اور اس فن کی مہارت کا ثبوت فراہم کرنا چاہتے تھے۔ملاّ صدرا کی اسفار اربعہ کا ترجمہ بھی اگر ان کی علمیت کا شاہکار رہے تاہم ایک ہندستانی عالم دین اور فلسفی شاہ شہید کی فلسفیانہ مباحث پر فقہی کتاب کا ترجمہ،ایک ہندی فلسفی کے قلم سے بہرحال،ان کے خیال میں،صوفی را صوفی می شناسد کے مطابق،اہل علم کے لیے ایک خاصے کی چیز ہوتا۔اور وجوہات بھی ہوں گی،ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ ملکی سیاست اور عثمانیہ یونیورسٹی کے حالات اور ان کے شعبہ دینیات کے احوال وظروف دگرگوں ہورہے تھے۔ان کے شعبے سے بہت اسی امتیازی سندات ختم کردی گئیں خود لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر ولی محمد نے خاکسار اور ڈاکٹر حمید اللہ کا نام دائرۃ المعارف کی انتظامی وعلمی کمیٹی سے خارج فرمادیا تھا،انھی ولی محمد نے شعبہ دینیات کے رعایتی وظائف ختم فرمادیئے تھے۔پی ایچ ڈی کا درجہ شعبہ دینیات سے نکال دیا تھا''(۶۲)

وہ یہ چاہتے تھے کہ ان کے قلم سے جو ایک عظیم کارنامہ سرانجام پایا ہے،وہ منصۂ شہود پر آجائے اور دنیا دیکھ لے کہ یہ شخص معقولات میں کس پایے کی کتابوں کا مترجم ہے۔انھوں نے شعبہ دینیات میں جدید علوم کو قبول کرنے کی مہم چلا رکھی تھی ان کا خیال تھا کہ دینیات کے نام سے قرآن،حدیث اور فقہ کی تعلیم دے قدیم علوم کی جگہ جدید علوم وفنون کو قبول کرلیا جائے(۶۳)۔لیکن لوگوں نے ان کی مخالفت کی وہ اسفار اربعہ میں ملاّ صدرا کے ذاتی حالات بھی دیباچہ میں ترجمہ کرچکے تھے یہی کچھ ان سے بیت رہی تھی۔ملاّ صدرا کی عبارت کا درج ذیل ترجمہ انھوں نے کیا تھا:

''اہل زمانہ کے ہاتھوں جن نادیدنی باتوں کو دیکھ رہا ہوں جو ناگوار باتیں سنی جارہی ہیں،لوگ جن ناانصافی اور جور وظلم کے عادی ہیں سربرآوردہ فضلا گرائے جارہے ہیں،کمینوں اور فرمایوں کو اونچا کیا

جارہا ہے، بدمعاش جاہل آگے بڑھ رہے ہیں، عاصی آدمی جسے کوئی نہ پہچانتا تھا آج بڑے زبردست عالم کی صورت اور فاضل یگانہ کی شکل میں نمایاں ہورہا ہے، جہاں اس قسم کی زیادتیوں کا مشاہدہ ہورہا ہو اور ایسے مفاسد لازمی ہوں یا متعدی پھیلے ہوئے ہوں وہاں آدمی کے لیے گفتگو کرنے یا سوال کے جواب دینے کا موقع تو با آسانی ملتا نہیں، پھر مشکلات فن اور مسائل کی پیچیدگیوں کے حل کا کیا موقع میسر آسکتا ہے'' (۶۴)

یہی وہ حالات تھے جن میں مولانا گیلانیؒ گھرے ہوئے تھے۔ وہ عبقات کا ترجمہ کر چکے تو اشاعت کے لیے انھی ایام میں کوشاں رہے لیکن ان کی زندگی میں عبقات کا ترجمہ شائع نہ ہوسکا یہ آخری خواہش تھی جو ان کی زندگی میں خوشی سے ہم کنار نہ ہوئی۔ دنیا جانتی ہے کہ ان کے قلم سے ہزاروں صفحات مختلف ومتنوع موضوعات قرآنی مباحث تفسیری نکات، حدیث، فقہ، سوانحی مواد، تاریخ، فلسفہ ومنطق، حالات حاضرہ پر اپنا نقطہ نظر، تعلیم وتربیت، سیرت وسوانح، الٰہیات، روحانیت، تصوف، کلامی مباحث، اقسام، کلامی مکاتب فکر ان کے خصائص، اختلافات کے مباحث پر سامنے آتے کتنے ہی مضامین ترجمہ کیے اور کتنے ہی اہل علم کو اعلیٰ تعلیم کے لیے تیار کیا یوں پوری زندگی درس وتدریس اور علمی مشاغل میں مصروف رہے۔

حاصل بحث:

مولانا گیلانی کی ترجمہ کردہ کتب، علمی دنیا میں ان کی خدمات کو یاد دلاتی رہیں گی ان کی علمی وادبی خدمات ان کی زندگی ہی میں اہل علم سے خراج تحسین وصول کر چکی تھیں۔ فلسفے کی ان کتابوں کے اردو تراجم ان کی انشا پردازی، زبان وبیان کی سلاست، برجستگی، بے ساختہ پن اور روانی وشادابی کے لحاظ سے یاد رکھے جائیں گے۔ ضرورت ہے کہ ان کے ترجمہ کردہ مضامین جو مختلف رسائل وجرائد میں مدفون پڑے ہیں، کتابی صورت میں شائع ہوں۔ ان کے مکاتیب، تبصرے، اور نظم ونثر کے گراں بہا جوہر تدوین وترتیب کے منتظر ہیں۔ ہم نے ان کے علمی کمالات میں سے صرف اردو ترجمے کے حوالے سے ان کی خدمات کا گذشتہ اوراق میں جائزہ لیا ہے اور اس حقیقت تک پہنچے ہیں کہ وہ اردو کے اہم مترجمین میں شمار کیے جانے کے مستحق ہیں۔ ہمارے اردو نقادوں نے ان کے تراجم کی خصوصیات کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی تاہم ان کے تراجم اپنی خصوصیات کے لحاظ سے اہل علم سے تعریف وتحسین حاصل کر چکے ہیں۔ ان معترفین میں اردو زبان وادب کے ثقہ مصنفین شامل ہیں جیسے سید سلیمان ندوی (۶۵)، مولانا عبدالماجد دریا بادی (۶۶)، مولانا ابوالحسن علی ندوی (۶۷)، مولانا عبد الباری ندوی (۶۸)، سید صباح الدین عبد الرحمٰن (۶۹)، مولانا سعید احمد اکبر آبادی (۷۰)، ڈاکٹر غلام محمد وغیرہ (۷۱)۔

حواشی وحوالہ جات

۱۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۸۷ء، ج اول، ص ۱۱

۲۔ گیلانی، تدوین حدیث، معارف، ماہنامہ، اعظم گڑھ، ج ۷۹، ش ۴، اپریل ۱۹۵۷

۳۔ وحید قریشی، ڈاکٹر (مدیر خصوصی)، تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان وہند، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۷۱ء، جلد ۸، ص ۸۷

۴۔ ایضاً ۵۔ عبدالباری ندوی، مولانا، مبادی علم انسانی (دیباچہ)، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۱۹۴۰ء، ص ۲

۶۔ عبدالحق، مولوی بابائے اردو، مرحوم دہلی کالج، انجمن ترقی اردو، کراچی ۱۹۵۰ء، ص ۱۳۰

۷۔ خلیق احمد نظامی، سرسید اور علی گڑھ تحریک، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۸۲ء، ص ۱۴۶

۸۔ گیلانی، مناظر احسن، مولانا، جبر السئیات بالحسنات کا آسان طریقہ، الرشید، ماہنامہ، دیوبند، ذیقعد ۱۳۳۴ھ، ص ۱۷

۹۔ گیلانی، مناظر احسن، مولانا، جبر السئیات بالحسنات کا آسان طریقہ، الرشید، ماہنامہ، دیوبند، ذیقعد ۱۳۳۴ھ

۱۰۔ البقرہ ۲:۱، ۲، ص ۴

۱۱۔ الاخلاص ۱۱۲:۱، ص ۷۳۱، تاج کمپنی، ریلوے روڈ لاہور، س۔ن ۱۲۔ المومن ۴۰:۶۰

۱۳۔ گیلانی، مناظر احسن، جبر السئیات بالحسنات.....الرشید، ماہنامہ، دیوبند، ذی قعدہ ۱۳۳۴ھ، تاج کمپنی، لاہور، س۔ن، ص ۱۸

۱۴۔ القرآن الکریم، مترجم شاہ رفیع الدین دہلوی، سورۃ المومن، ۴۰، تاج کمپنی، لاہور، س۔ن، ص ۸۷۰

۱۵۔ ایضاً، مترجم شاہ عبدالقادر دہلوی، سورۃ المومن ۴۰، تاج کمپنی، لاہور، س۔ن، ص ۸۴۷

۱۶۔ ایضاً، مترجم ڈپٹی نذیر احمد دہلوی، سورۃ المومن ۴۰، تاج کمپنی، لاہور، س۔ن، ص ۵۷۰

۱۷۔ ایضاً، مترجم اشرف علی تھانوی، سورۃ المومن ۴۰، تاج کمپنی، لاہور، س۔ن، ص ۴۲۸

۱۸۔ مناظر احسن گیلانی، جبر السئیات بالحسنات، الرشید، دیوبند، ذی قعدہ ۱۳۳۴ھ/۱۹۱۶ء

۱۹۔ گیلانی مناظر احسن، سید، مولانا، تاثیر الادویہ، الرشید، ماہنامہ، دیوبند، محرم الحرام، ۱۳۳۵ھ/۱۹۱۸ء، ص ۹

۲۰۔ گیلانی مناظر احسن، سید، مولانا، عمر الدنیا، الرشید، ماہنامہ، دیوبند، ذیقعدہ ۱۳۳۴ھ/۱۹۱۶ء، ص ۲۳

۲۱۔ عبدالقوی دریابادی، ذکر ماجد، عبدالماجد دریابادی اکیڈمی لکھنؤ، ۱۹۸۱ء، ص ۳۲

۲۲۔ عبدالماجد دریابادی، خطوط مشاہیر، تاج کمپنی، لاہور، ۱۹۴۴ء، ج اول، ص ۲۷

۲۳۔ شاہجانپوری، ابوسلمان ڈاکٹر، مکاتیب ابوالکلام آزاد، اردو اکیڈمی، سندھ، کراچی، ۱۹۶۷ء، ص ۴۴

۲۴۔ شاہجانپوری، ابوسلمان ڈاکٹر، ابوالکلام آزاد وعبدالماجد (ادبی معرکہ)، ادارہ تصنیف وتحقیق پاکستان، کراچی، ۱۹۸۷ء، ص ۲۳

۲۵۔ ابوالکلام آزاد، مسلمان عورت، کتب خانہ ایم ثناء اللہ خان ریلوے روڈ، لاہور، ۱۹۵۶ء، ص ۳۳۲، ۳۳۳

۲۶۔ گیلانی مناظر احسن، سید، مولانا، الرشید، ماہنامہ، دیوبند، ذی قعدہ ۱۳۳۴ھ/۱۹۱۶ء

۲۷۔ عبدالباری ندوی، مبادی علم انسانی، دارالمصنفین اعظم گڑھ، انڈیا، ۱۹۴۶ء، ص ۵۲

۲۸۔ مناظر احسن گیلانی، عمر الدنیا، ماہنامہ، الرشید، دیوبند، ذیقعدہ ۱۳۳۴ھ

۲۹۔ شاہجہانپوری، ابوسلمان، ڈاکٹر، مکاتیب ابوالکلام آزاد، اردو اکیڈمی، سندھ، کراچی، ۱۹۶۷ء، ص ۱۹
۳۰۔ عبدالماجد دریابادی، آپ بیتی، مجلس نشریات اسلام، کراچی، ۱۹۷۹ء، ص ۶۷۹
۳۱۔ مناظر احسن گیلانی، ماہنامہ، الرشید، ذی قعدہ ۱۳۳۴ھ
۳۲۔ مناظر احسن گیلانی، الرشید، ماہنامہ، دیوبند، جمادی الاول، ۱۳۳۵ھ، ص ۳۰ ۳۳۔ ایضاً، جمادی الثانیہ، ۱۳۳۵ھ
۳۴۔ تحسین فراقی، ڈاکٹر، عبدالماجد دریابادی، احوال و آثار، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۹۳ء، ص ۱۶۳
۳۵۔ عبدالماجد دریابادی، الناظر، ماہنامہ لکھنؤ، مارچ ۱۹۱۰ء
۳۶۔ خورشید احمد، پروفیسر (مرتب)، ادبیات مودودی، اسلامک پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۷۲ء، ص ۲۱۲
۳۷۔ عبدالماجد دریابادی، الناظر، یکم مارچ ۱۹۱۰ء، بحوالہ عبدالماجد دریابادی، ص ۲۸، ص ۱۶۴
۳۸۔ گیلانی، سورہ یوسف کے ایک واقعہ کی تفسیر، معارف، ماہنامہ، اعظم گڑھ، ج ۵، ش ۵، شعبان المعظم ۱۳۳۸ھ/مئی ۱۹۲۰ء،
۳۹۔ مولانا سید مناظر احسن گیلانی شخصیت اور سوانح، ص ۴۶
۴۰۔ عبدالرحمٰن عبد، چودھری، مفکر اسلام سید ابوالاعلیٰ مودودی، اسلامک پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۶۹
۴۱۔ ثروت صولت، مولانا مودودی کی تقاریر، حصہ اول، اسلامک پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۷۶ء، ص ۱۰۰
۴۲۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۷۳ء، ج ۱۲، ص ۸۰
۴۳۔ حسنِ نصر، ملّا صدرا، مقالہ مشمولہ، اردو دائرہ معارفِ اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۷۳ء، ج ۱۲، ص ۸۲، ۸۳
۴۴۔ محمد اقبال، علامہ، فلسفہ عجم (اردو ترجمہ: میر حسن الدین)، دی ڈویلپمنٹ آف میٹافزکس ان پرشیا، نفیس اکیڈمی، کراچی، جنوری ۱۹۴۹ء، ص ۲۳۴
۴۵۔ مناظر احسن گیلانی، اسفار اربعہ، ص ۱۴ ۴۶۔ ایضاً، اسفار اربعہ، (مترجم)، ص ۲۳
۴۷۔ مفتاحی، حیات مولانا گیلانی، ص ۲۳۵
۴۸۔ عبدالماجد دریابادی، وفیات ماجدی، عبدالماجد اکیڈیمی لکھنو، ۱۹۷۸ء، ص ۷۷
۴۹۔ تحسین فراقی، ڈاکٹر، عبدالماجد دریابادی احوال و آثار، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ص ۲۶۱، ۲۶۲
۵۰۔ ابوالکلام آزاد، مسلمان عورت، ص ۲۱۱ ۵۱۔ مناظر احسن گیلانی، اسفار اربعہ، ص ۱۷۵۶
۵۲۔ شیرازی، صدرالدین، اسفار اربعہ، مناظر احسن گیلانی (مترجم)، دارالطبع جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد دکن، ۱۹۴۳ء، ج دوم، حصہ اول، ص ۱۷۸۴
۵۳۔ تبصرہ کتب، برہان، ماہنامہ، دہلی، مئی ۱۹۴۹ء، ص ۱۹۱
۵۴۔ تبصرہ کتب، صدق جدید، ہفت روزہ لکھنؤ، ۲۵ جنوری ۱۹۶۳ء، ص ۵
۵۵۔ شاہ اسماعیل شہید، عبقات، مناظر احسن گیلانی (مترجم)، ادارہ اسلامیات، لاہور، س۔ن، ص ۷
۵۶۔ مناظر احسن گیلانی (مترجم)، عبقات (اردو)، ادارہ اسلامیات، لاہور، س۔ن، ص ۲۰۵، ۲۰۶
۵۷۔ عبدالباری ندوی، مبادی علم انسانی، ص ۳، ۴ ۵۸۔ عبقات (اردو)، ص ۲۰۵
۵۹۔ گیلانی، مناظر احسن، سید، احاطہ دارالعلوم میں بیتے ہوئے دن، رسالہ دارالعلوم دیوبند، بابت ذی الحجہ ۱۳۷۰ھ، ص ۴۰
۶۰۔ شاہ اسمٰعیل شہید، عبقات (مترجم: احمد شکیب، محمد ضیاء الدین)، ادارہ اسلامیات، لاہور، س۔ن، ص ۶
۶۱۔ مکاتیب گیلانی بنام سید سلیمان ندوی، معارف، ماہنامہ، اعظم گڑھ، جولائی ۱۹۶۳ء، (مکتوب ۲۵ دسمبر ۱۹۴۸ء)

۶۲۔ ایضاً، معارف، ماہنامہ، اعظم گڑھ، اپریل ۱۹۶۳ء، (مکتوب ۷ دسمبر ۱۹۴۴ء)
۶۳۔ مناظر احسن گیلانی (مترجم)، اسفار اربعہ (اردو)، ص ۱۲
۶۴۔ ندوی، سید سلیمان، تدوین حدیث (مقدمہ)، مجلس علمی، کراچی، ۱۹۵۶ء، ص ۸
۶۵۔ عبدالماجد دریابادی، وفیات ماجدی، عبدالماجد اکیڈیمی لکھنؤ، ۱۹۷۸ء، ص ۷۷
۶۶۔ ندوی، ابوالحسن علی، پرانے چراغ، مجلس نشریات اسلام، کراچی، ۱۹۸۱ء، ص ۶۳، ۶۴
۶۷۔ منت اللہ رحمانی (مرتب)، مکاتیب گیلانی (مقدمہ)، ص ۵۰
۶۸۔ صباح الدین عبدالرحمٰن، مولانا مناظر احسن گیلانی، معارف، ماہنامہ، اعظم گڑھ، ج ۷۹، نمبر ۳، مارچ ۱۹۵۷ء
۶۹۔ اکبر آبادی، سعید احمد، مولانا، نظرات، برہان، ماہنامہ، دہلی، جولائی ۱۹۵۶ء
۷۰۔ مقالات احسانی (مقدمہ)، ص ۲۴